چھمی بیگم۔قرۃ العین حیدر کا ایک کردار

ایم خالد فیاض

اُردو افسانے کے حوالے سے جب وقت اور حالات سے مفاہمت یا سمجھوتے کا موضوع زیر بحث آئے تو پہلا نام فوراً غلام عباس کا ذہن میں آتا ہے اور خاص طور پر اُن کا افسانہ ''سمجھوتا'' اس ضمن میں نمائندگی کا حق ادا کرتا ہے۔لیکن ایسے چیدہ چیدہ کردار بیش تر افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہیں جو مخصوص صورتِ حال میں مفاہمت کی طرف رغبت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔قرۃ العین حیدر جیسی افسانہ نگار جس کے بیش تر کردار وقت کے جبر یا اُس میں گم شدگی کا شکار ہو جاتے ہیں، کے ہاں بھی ایسے دو تین کردار ضرور مل جاتے ہیں جو وقت اور حالات سے مفاہمت کرتے دکھائی دیتے ہیں اور وقت کے ہاتھوں کچلے جانے سے خود کو بچا لیتے ہیں۔خاص طور پر ''حسب نسب'' کی چھمی بیگم اور ''پت جھڑ کی آواز'' کی تنویر فاطمہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔مگر چھمی بیگم کو تنویر فاطمہ پر اس حوالے سے فوقیت حاصل ہے کہ وہ وقت کے تھپیڑوں سے بیش تر اپنا پینترا بدل لینے پر قدرت رکھتی ہے جب کہ تنویر فاطمہ وقت کے تھپیڑے سہنے کے بعد مفاہمتی پالیسی اختیار کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آخر میں تنویر فاطمہ نسبتاً خستہ حالی کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ وہ اگر چہ اپنے آپ کو کچلے جانے سے تو بچا لائی ہے مگر وقت کے تھپیڑے سہنے سے وہ اس وقار اور اطمینان کو حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے جو چھمی بیگم کے ہاں نظر آتا ہے۔

چھمی بیگم، شاہ جہاں پور کے ایک اوسط درجے کے زمین دار خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے بچپن سے ضدی، غصیلی اور طنطنے والی تھیں۔والدین اور چچا چچی کے انتقال اور للو میاں کی بے وفائی نے چھمی بیگم کو گھر میں اکیلا اور بے آسرا کر دیا۔مگر ان حالات میں چھمی بیگم آس اور امید کا دامن نہیں چھوڑتیں۔

> ''اپنی اس شدید یاس و ناامیدی کے باوجود چھمی بیگم کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن للو واپس آئیں گے۔چنبیلی والا مکان پھر آباد ہوگا''۔

اسی آس میں وہ تیس برس کی ہوگئیں۔ بال وقت سے پہلے سفید ہونے لگے مگر غصے اور طنطنے میں اور تمکنت میں کمی نہ ہوئی بل کہ عمر کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ "ماں باپ خالص اصل نسل روہیلے پٹھان، دادا پردادا ہفت ہزاری نہ سہی یک ہزاری، دو ہزاری ضرور ہی رہے ہوں گے"۔ لہٰذا "ماضی کے ان جغادری روہیلہ سرداروں کے نام لیوا اس کنبے کے حسب نسب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے اس فکر میں وہ بالکل قلعہ بند ہو کر بیٹھی رہیں"۔

ایسی صورت میں پہلا انقلاب اُن کی زندگی میں تب آتا ہے جب اچھو میاں لکھنو کی ایک طوائف سے نکاح کر کے گھر لے آتے ہیں یعنی صرف یہ نہیں کہ اچھو میاں نے چھمی بیگم کی زندگی تباہ کر کے کسی اور سے شادی کر لی بل کہ کلوبائی طوائف سے نکاح کر کے خاندان کا حسب نسب برباد کر دیا اور چھمی بیگم خاص طور پر اس جرم کے لیے انھیں مرتے دم تک معاف نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا چھمی بیگم نے اچھو میاں کے گھر کی ہر شے اور روپے پیسے کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور صاف للکارانہ اعلان کر دیا کہ

"جمعہ خان مرحوم کی بیٹی اور شبو خان مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے"۔

اب چھمی بیگم کی گزر اوقات نہایت مشکل سے ہونے لگی۔ شادی کی عمر گزر گئی۔ مدرسہ چلانے لگیں مگر ملک تقسیم ہو گیا تو مدرسہ بھی اجڑ گیا اور چھمی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ اچھو میاں فسادات میں مارے گئے۔

چھمی بیگم کا سر اب سفید ہو گیا اور غصہ بھی دھیما پڑ گیا، طنطنے اور جلال میں بھی کمی واقع ہو گئی اور وہ دہلی کے ایک گھرانے میں استانی کی ملازمت کرنے پر راضی ہو گئیں کیوں کہ:

"اُن کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ اگر کل کلاں کو مر گئیں تو آخر وقت میں یٰسین شریف پڑھنے والا تو کوئی ہونا چاہیے"۔

لہٰذا چھمی بیگم بنتِ جمعہ خان زمین دار شاہ جہاں پور مغلانی جی بن گئیں اور پورے بارہ سال صبیح الدین صاحب کے گھر میں بچوں کو اُردو اور قرآن شریف پڑھانے میں گزار دیے۔ یہاں انھیں بچوں سے محبت بھی ہو گئی۔ اُن سے بزرگوں جیسا سلوک کیا جاتا مگر پھر بھی انھیں کبھی کبھی غصہ آتا جسے وہ "اپنی مجبوریوں کا خیال کر کے پی جاتی تھیں"۔

بیگم صبیح الدین کے بعد انھیں بیگم راشد علی کے گھر ملازمت ملی جو بیگم صبیح الدین کی طرح دردمند اور دین دار خاتون نہیں بل کہ آج کل کی ماڈرن لڑکیوں کی طرح تھیں، جن کا بیش تر وقت کلبوں اور پارٹیوں میں گزرتا تھا۔ لیکن بہ ہر حال چھمی بیگم کی عزت انھوں نے بھی کی۔ یہاں چھمی بیگم نے پانچ برس ملازمت کی اور اب چھمی بیگم کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی، یہاں تک کہ:

''جب چھمی بیگم روشن آرا کلب پہنچیں۔ لنچ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ چھمی بیگم بچی کو انگلی پکڑے سبزے پر ٹہلتی رہیں۔ چھمی بیگم اب پردہ نہیں کرتی تھیں اور ساڑھی پہنتی تھیں۔ اس نگوڑی دتی میں انھیں پہچاننے والا اب کون رہا تھا... سترہ برس نئی دتی میں رہ کر چھمی بیگم اس نئی اعلیٰ سوسائٹی اور جدید ہندوستانی خواتین کی الٹرا ماڈرن طرز زندگی کی بھی عادی ہو چکی تھیں۔ اس لیے چھمی بیگم اطمینان سے گھاس پر ٹہلا کیں''۔

راشد صاحب کا تبادلہ واشنگٹن ہو گیا اور مسئلہ یہ آن پڑا کہ چھمی بیگم کا کیا ہو۔ کلب میں بمبئی کی ایک خاتون نے جب اچانک ملازمت کی پیش کش کی تو چھمی بیگم ''فوراً دل میں رب کریم کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائیں جو رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول بھی دیتا ہے''۔

چھمی بیگم کے کردار میں حالات کے تلخ حقائق کو جھیلنے اور مجبوری کے عالم میں زندگی سے سمجھوتے کرتے چلے جانے سے ایک لاتعلقی کا سا احساس بھی جنم لے لیتا ہے جو فطری ہے۔ کیوں کہ سمجھوتے شخصیت کی اوپری سطح سے ہو رہے ہوتے ہیں، داخل میں کہیں کش مکش اور تلخی کی کیفیت برابر جاری رہتی ہے اور اُس کا اظہار زندگی سے لاتعلقی کی صورت میں ہوتا ہے جو زیادہ واضح نہیں مگر گہرا ضرور ہوتا ہے۔ چھمی بیگم کے کردار پر اس احساس کی چھوٹ بڑی شدت سے پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ خاص طور پر بمبئی کی خاتون رضیہ بانو سے جب بمبئی پہنچنے کا وعدہ ہو جاتا ہے تو قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''انھوں (چھمی بیگم) نے رضیہ بانو سے تنخواہ کا فیصلہ بھی نہ کیا کیوں کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے ایک تنخواہ مقرر کر لی تھی۔ چالیس روپے ماہ وار اور کھانا۔ یہ چالیس روپے ان کی ذاتی ضروریات کے لئے ضرورت سے زیادہ تھے۔ کپڑے ہمیشہ انھیں اپنی بیگموں سے مل جاتے تھے۔ عرصہ ہوا انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ کپڑے، لتے، گہنے پاتے، جائیداد، املاک، رشتے ناتے، دوستی محبت، سب بے معنی اور فانی چیزیں ہیں''۔

اور پھر رضیہ بانو جب توقع کے برخلاف ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ نکال کر "سفر خرچ" کے لیے چھمی بیگم کے حوالے کرتی ہیں تو چھمی بیگم اس وقت بھی کسی حیرت کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔

"چھمی بیگم نے خاموشی سے نوٹ صدری کی جیب میں اڑس لیے۔انھوں نے اب زندگی کے انوکھے واقعات پر متعجب ہونا بھی چھوڑ دیا تھا"۔

یوں قرۃ العین حیدر چھمی بیگم کے کردار میں خارجی دباؤ کے زیر اثر پیدا ہونے والے داخلی ردعمل کی موثر عکاسی کرنے میں کام یاب ٹھہرتی ہیں۔

بہ ہر حال چھمی بیگم بمبئی کے لیے روانہ ہو جاتی ہیں۔روانہ ہونے سے پہلے جب بیگم راشد متفکر ہو کر پوچھتی ہیں کہ "خالہ تم اکیلی اتنی دور کا سفر کرلوگی؟" تو چھمی بیگم فوراً اقرار میں سر ہلا دیتی ہیں کیوں کہ چھمی بیگم کو اب زندگی میں کسی بات کے لیے 'نہیں' کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی"۔

چھمی بیگم کی آنکھیں جو اپنے مکان میں برسوں غسل خانے کی کھرچی ہوئی کھڑکی کے ذرا سے حصے سے صرف اچھو میاں کے مکان کا آنگن دیکھنے تک محدود رہی تھیں اب بمبئی جیسے بڑے اور تیز رفتار شہر کی بڑی بڑی عمارتوں کو دیکھ رہی تھیں اور شہر کی ان عمارتوں کو دیکھتے دیکھتے وہ آخر رضیہ بانو کے وسیع و عریض فلیٹ میں پہنچ گئیں۔

بیگم صبیح الدین دردمند بھی تھیں اور دین دار بھی، بیگم راشد دین دار نہیں تھیں اور بیش تر وقت کلبوں اور تقریبات میں گزارتی تھیں مگر گھر میں رکھ رکھاؤ بہتر تھا جب کہ یہاں رضیہ بانو کے اطوار تو سب سے جُدا تھے۔چھمی بیگم جب پہلی بار اُن کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ نائیلون کا نائٹ گون پہنے نیم دراز تھیں اور انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔اس صورت حال کا سامنا ہونے پر چھمی بیگم کا ردعمل اور مفاہمتی کردار ملاحظہ کیجیے:

"چھمی بیگم کو اُن کا یہ ننگا پہناوا ذرا بھی پسند نہ آیا لیکن سوچا بھائی اپنا اپنا دستور ہے اس شہر کے یہی رنگ ڈھنگ ہیں۔رضیہ بانو کا سگریٹ بھی انھیں اچھا نہ لگا۔بیگم صبیح الدین اور بیگم راشد دونوں سگریٹ نہیں پیتی تھیں۔بہ ہر حال انھوں نے بردباری سے کہا، السلام علیکم"۔

رضیہ بانو ایک بازاری عورت تھی اور لڑکیوں کا دھندا بڑے معززانہ انداز میں کرتی تھی۔چھمی بیگم کو

وہ محض اس لیے گھر میں لائی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ: ''کوئی بزرگ بی بی میرے گھر میں نماز قرآن پڑھتی رہا کریں''۔ اس لیے وہ چھمی بیگم سے کہتی ہے کہ ''قرآن شریف پڑھیے اور میرے حق میں دعائے خیر کرتی رہیے'' لہٰذا:

''چھمی بیگم نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر ایک بار پھر جائے نماز نکالی، وضو کیا، نفلیں پڑھنے لگیں اور اس رب ذوالجلال کا شکر ادا کیا......اور اسی پاک پروردگار نے ان کے باپ دادا کی لاج، ان کے حسب نسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کی حق حلال کی کمائی میں ان کا حصہ بھی لگا دیا''۔

وہ چھمی بیگم جنھوں نے للو میاں کے ماہانہ خرچ اور کھانے پینے کی دوسری اشیا سے محض اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ اپنے حسب نسب کی بنیاد پر ایسے گھرانے سے آیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہیں جہاں طوائف نکاح کر کے لائی گئی ہو۔ بل کہ چھمی بیگم نے تو للو میاں کے گھر کو 'چکلہ'' ہی کہہ دیا تھا۔ اور اب صورت حال یہ ہے کہ خود اصلی چکلے میں آن بیٹھی ہیں اور یہ سمجھ رہی ہیں کہ رزق حلال کما رہی ہیں۔ اس طرح قرۃ العین حیدر وقت کی ستم ظریفی اور Irony کو انتہائی موثر پیرائے میں بیان کر جاتی ہیں۔

اسی Irony کی وجہ سے قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ ''حسب نسب'' نہ صرف ''پت جھڑ کی آواز'' سے بل کہ غلام عباس کے افسانوں ''سمجھوتا'' اور ''ایک دردمند دل'' سے بھی، جہاں کردار حالات سے سمجھوتا کرتے دکھائی دیتے ہیں، برتر ہے۔ غلام عباس کے ان افسانوں میں Irony کی یہ شدت نہیں جو قرۃ العین حیدر کے اس افسانے میں ہے۔ پھر یہ کہ چھمی بیگم کا کردار ایک پوری تہذیب کے زوال کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے جب کہ تنویر فاطمہ کا کردار یا غلام عباس کے کردار جذباتی اور معاشرتی اقدار کے زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اسی لیے چھمی بیگم کے کردار کا کینوس ''سمجھوتا'' کے وہ ''ایک دردمند دل'' کے فضل اور تنویر فاطمہ سے زیادہ وسیع ہے۔

دوسرا یہ کہ افسانے میں کردار کا سامنا یک دم کسی غیر متوقع یا شدید صورت حال سے کہیں نہیں ہوتا کیوں کہ اس طرح مفاہمت غیر فطری تاثر کی حامل ہو جاتی۔ حالات اور واقعات میں بہ تدریج شدت پیدا کی گئی ہے تا کہ کردار کی مفاہمت فطری انداز میں اجاگر ہو۔ چھمی بیگم کے کردار میں یہی فطری تغیر اس کردار کا حُسن بن جاتا ہے اور جس کا گہرا تاثر دل و دماغ پر اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

سمبل

تزئین: سلیم پاشا
خطاطی: رحیم شاہ
حروف چینی: صابر خاکی
زرِ سالانہ:
اندرونِ ملک: عام ڈاک سے: ۳۰۰ روپے، رجسٹرڈ رکوریئر سے: ۴۰۰ روپے
بھارت: ۶۰۰ روپے، یورپ رامریکا رشرقِ وسطیٰ: ۱۳۰ امریکی ڈالر
ذرائع ترسیلِ زر:
منی آرڈر رچیک (جو راولپنڈی راسلام آباد کے بنک سے کیش ہو سکے) بنام سہ ماہی 'سمبل'

ضابطہ:
سمبل میں شائع شدہ کسی بھی تحریر اور اس کے مصنف سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ادارہ)
سمبل میں شائع شدہ تحریروں کو علمی مقاصد کے لیے بغیر اجازت کسی بھی کتاب، رسالے یا ویب سائٹ میں حوالے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

رابطہ:
ای میل: symlit@yahoo.com alimfashi@yahoo.com
سیل فون: 0300-5582082
خط کتابت رترسیلِ زر: رانی مارکیٹ، ٹینچ بھاٹا، راولپنڈی کینٹ

ناشر:
علی محمد
طابع:
الف۔ آئی پرنٹرز، خورشید پلازا، کشمیر روڈ، صدر، راولپنڈی

مدیر: علی محمد فرشی

(شناختِ خاص: بورخیس)

جنوری تا جون ۲۰۰۸ء

جلد: ۲

شمارہ: ۳/۴

قیمت فی شمارہ: ۷۵ روپے

قیمت موجودہ شمارہ: ۱۸۰ روپے

رانی مارکیٹ، ٹینچ بھاٹا، راول پنڈی کینٹ، پاکستان

مدیر: علی محمد فرشی
سمبل